© rasailojaraid.com

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
مہتمم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ندوۃ العلماء کے جشنِ تعلیمی کا خطبۂ استقبالیہ

برصغیر کے مسلمانوں کی علمی و دینی خدمات کا ایک جائزہ

۲۵ شوال ۱۳۹۵ھ ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ندوۃ العلماء لکھنؤ کا عظیم الشان جشن تعلیمی منعقد ہوا جس میں عالم عرب افریقہ اور یورپ سے مایۂ ناز علماء، مفکرین اور مشائخ نے شرکت کی یہ برصغیر کی تاریخ کا ایک شایانِ شان علمی جشن اور مسلمانانِ برصغیر کی عظیم علمی خدمات کا اعتراف تھا۔ ہمارے مخدوم حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا اور اپنے مکتوبات گرامی کے ساتھ الحق میں اشاعت کے لئے بھی ارسال فرمایا اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ "یہ اس تحقی برّ اعظم کے مسلمانوں کے ایک منشور اور میثاق کی حیثیت رکھتا ہے اور ان کی علمی و دینی خدمات کا ایک دیانتدارانہ جائزہ ہے۔" "ادارہ"

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ

جناب صدر، معزز نمائندگان، مہمانانِ کرام، شرکاء اجلاس!

سب سے پہلے میں اپنی طرف سے نیز اپنے رفقاء کار، جماعت علماء، ملتِ اسلامی ہند کی طرف سے آپ کی خدمت میں اسلام اور علم کا دوہرا سلام پیش کرتا ہوں یہ سلام ہے نئے اور چھوٹے ساتھیوں کا، اپنے بڑے اور تجربہ کار ساتھیوں کو، ہمراہیوں اور رفیقوں کا ہمراہیوں اور رفیقوں کو، اس لئے کہ ہم سب اسلام کے رواں دواں قافلہ میں شامل اور علوم اسلامیہ کے طویل کارواں کے ہمسفر ہیں استادی و شاگردی، بزرگی و خوردی اور اصل و نقل کے اعتبار سے ہمارے درمیان یقیناً فرق و تفاوت ہے، لیکن اسلام کے سایۂ عاطفت اور علم کے مقدس رشتہ نے ہم کو ایک لڑی کے موتیوں کی طرح پرو دیا ہے۔ ہم سب اسلام ہی کے ساختہ پرداختہ قرآن کے خوانِ کرم کے ریزہ چیں، اور درسگاہ محمدی کے مختلف درجوں اور استعدادوں کے طالب علم اور مکتب نشیں ہیں۔

حضرات! میں آپ کا ہندوستان کی اس سرزمین میں خیر مقدم کرتا ہوں، جہاں مذہب، تہذیب و ثقافت کی پوری تاریخ میں ایک انوکھا اور منفرد تجربہ کیا گیا۔ اور یہ تجربہ غیر معمولی اور بے مثال طریقہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کامیاب رہا۔ اس سرزمین میں جب اسلام کے قدم آئے تو اس کے جلو میں علم و تہذیب بھی تھی۔ اور وہ مسلکِ زندگی بھی، جو زبان، کلچر، قوم و نسل اور قومی عادات و خصائل کا پابند نہیں، دیکھنے والوں کو بہت جلد نظر آ گیا کہ اسلام کے خمیر میں ایک ایسی باطنی قوت پوشیدہ ہے جو خوابیدہ صلاحیتوں کو جگاتی، ذہانت کے خشک سوتوں کو روانی بخشتی اور انسانی صلاحیتوں اور طاقتوں کو، انسانی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنا سکھاتی ہے۔ اس کے ساتھ اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ انسان کی فطرتِ سلیم خود بڑھ کر دینِ فطرت کا استقبال کرتی ہے اور اس کے ساتھ اس طرح ہمنوا اور ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ جیسے وہ اس کے انتظار میں دن گن رہی تھی۔ اس سے ہمیں جہاں اس دین کی اس مخفی صلاحیت و طاقت کا اندازہ ہوا، وہاں اس زمین کی نرمی اور زرخیزی کا بھی۔ جس نے اس نہالِ تازہ کو اس آسانی کے ساتھ قبول کیا۔ اور پھلنے پھولنے کا موقع دیا، اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ علومِ اسلامیہ کا درخت ہر طرح کی زمین اور ہر قسم کی آب و ہوا میں برگ و بار لاتا اور نئے نئے شگوفے کھلاتا ہے۔ نیز یہ کہ دوسرے شاداب درخت سے قلم لگانے سے اسکی قوتِ نمو، اور شادابی بڑھ جاتی ہے۔

ان حقیقتوں کے ساتھ ایک اور نئی حقیقت کا انکشاف ہوا، جو اقوام و ملل کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے، وہ یہ کہ تنہائی اور مسافرت کے احساس، اپنے اصل سرچشمہ سے دوری، تازہ رسد اور نئی کمک سے مایوسی نے اس نو وارد کا حوصلہ پست، اور اس کو اپنے مستقبل سے مایوس اور ہراساں کرنے کی بجائے اس کے دل کو ایک نئی طاقت اور نئے نئے جوش اور نئے اعتماد سے معمور و مخمور کر دیا۔ اس نے اس صورتِ حال سے شکستگی اور مایوسی کا سبق لینے کی بجائے ہمت و جرأت، خدا کی نصرت غیبی، اور اپنے ناتواں بازوؤں پر اعتماد کرنے کا سبق لیا، اس کو اپنے پیغام و دعوت کی صلاحیت و افادیت اور اس ملک میں اس کی ضرورت پر یقین تھا، یہ احساس کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اسلام کی ایک دور دراز سرحد کا محافظ اور پاسبان بنایا ہے اور اس کے دفاع کی ذمہ داری تنہا اسی کے سر پر ڈالی ہے۔ ایک مختصر سے مختصر اقلیت کو ایسی قوت عطا کرتی ہے جس سے انقلاب انگیز اور محیر العقول کارنامے وجود میں آتے ہیں۔ وہ ہر آزمائش میں پوری اترتی ہے۔ وہ اقوامِ عالم کے سابقہ تجربات کی تردید کرتی ہے۔ اور مادہ پرستانہ منطق اور ریاضی کے جامد اصولوں اور اعداد و شمار کے بے روح و بے رحم فلسفے کو غلط ثابت کر دیتی ہے۔

اسلام کا یہ مختصر اور اوّلین قافلہ، اس ملک میں پردیسی کی طرح وارد ہوتا ہے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کو اپنا عزیز وطن اور محبوب مسکن بنا لیتا ہے۔ اس ملک کے اصلی باشندے اس کی محبت کا دم بھرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لگتے ہیں۔ اور ان نووارد انسانوں کی شکل میں ان کو محبت کرنے والے بھائی، شفیق استاد، خیر خواہ حاکم، آزمودہ کار منتظم، ماہر فن کاریگر، اور بلند پایہ عالم و دانشور مل جاتے ہیں۔ یہ اسلامی نوآبادی، اپنی ذہنی صلاحیت علمی تجربہ، قوت ایجاد و اختراع، قوت عمل اور انتظامی صلاحیت کا ایک ایک قطرہ اس سرزمین میں نچوڑ دیتی ہے۔ یہاں ترکوں کی سپہ گری و ترک تازی، مغلوں کی اولوالعزمی، افغانوں کی غیرت قومی، ایرانیوں کا ذوق جمال و رعنائی خیال، عربوں کی حقیقت پسندی اور ذوق سلیم، ملک کے باشندوں کی نرم خوئی اور صلح جوئی اور شعر و نغمہ و فلسفہ و تصوف سے فطری مناسبت سے آکر گھل مل گیا۔ ان سب مختلف (اور بعض اوقات متضاد) صفات پر اسلام کے عقیدۂ توحید کا پرتو اور اس کی عادلانہ تعلیمات کا عکس اس طرح پڑا کہ اس نے ان کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا اور ان کو ایک دوسرے سے شیر و شکر کر کے ایک نئی زندگی بخشی، اس کے نتیجہ میں ایک نئی تہذیب وجود میں آئی جس کو ہم بجا طور پر "اسلامی ہندوستانی تہذیب" کہہ سکتے ہیں۔

اس نئے عہد کے آغاز کے ساتھ ہندوستان میں ایک نیا تہذیبی، فکری و علمی دبستان وجود میں آیا جو اپنی ایک مستقل شخصیت اور نمایاں کردار رکھتا تھا، اس نے بڑی تعداد میں ایسے ماہرین فن، موجدین علوم اور ارباب فضل و کمال پیدا کئے جو خود مختلف مکاتب خیال کے بانی تھے۔ جنہوں نے علم کی نئی دنیاؤں سے اس ملک کو روشناس کیا اور نہ صرف علوم دینیہ تفسیر و حدیث، اور فقہ و عقائد میں ان کی پیشوائی و سرداری تسلیم کی گئی بلکہ عربی لغت و زبان و ادب میں بھی علماء عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ اور ان کی بعض تصانیف نے ان علوم میں بنیادی ماخذ اور سند کی حیثیت اختیار کر لی۔ ان میں کچھ کتابیں پورے اسلامی کتب خانہ میں اب تک بے نظیر اور منفرد ہیں۔

اس مدرسۂ فکر نے تصنیف و تالیف کی اس تحریک کو جو آٹھویں صدی ہجری (پندرھویں صدی عیسوی) کے بعد ذہنی اضمحلال، اور علمی زوال کا شکار ہو چکی تھی، نیا خون اور نئی زندگی عطا کی، تاتاریوں کے فتنۂ عالم آشوب میں اس نے بعض اسلامی علوم کے لئے پناہ گاہ کا کام دیا، اور عہد آخر میں اس کو حدیث نبوی کی خدمت و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز بننے کا شرف حاصل رہا۔ جہاں سے اس فن شریف کی شعاعیں دوسرے ملکوں میں پھیلیں اور "درآمد" کی بجائے "برآمد" کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سرزمین میں یکتائے زمانہ اور سرآمد روزگار علماء و ائمۂ فن پیدا ہوئے اور اس موضوع پر بہتر سے بہتر کتابیں یہاں تیار کی گئیں۔

یہاں کے متعدد علمائے حق اور ارباب دعوت و عزیمت نے مختلف زمانوں میں اصلاح و تجدید اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا وہ کار عظیم انجام دیا جس کی صدائے بازگشت ہر جگہ سنی گئی اور اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مبارک اثرات دنیائے اسلام کے دور دراز حصوں تک پہنچے، اور لاکھوں انسانوں نے ان کے فیض اثر سے اپنے قلب و روح کی پیاس بجھائی اور دلوں کو روشن کیا۔

تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ اس ملک کو جدید تاریخ کا سب سے بڑا تہذیبی و ثقافتی اور فکری معرکہ پیش آئے اور افکار و اقدار کی سب سے بڑی کش مکش سے اس کو گذرنا پڑے، یہ مغربی تہذیب و فلسفہ اور اسلامی تہذیب و فلسفہ کا معرکہ اور اسلامی طرزِ فکر اور مغربی طرزِ فکر کی کشمکش تھی اور در اصل ایک سخت خونریز، بے رحم اور طویل جنگ تھی۔

ملت اسلامیہ ہند نے جو ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں ناکامی سے زخم خوردہ اور برطانوی فتح سے دہشت زدہ ہو رہی تھی اپنے کو اچانک ایک ایسی جواں سال، تازہ دم، ابھرتی ہوئی بلکہ زندگی اور جوش و جوانی سے ابلتی ہوئی مغربی تہذیب کے سامنے اس طرح پایا کہ درمیان میں کوئی پردہ یا حجاب نہ تھا۔ یہ انگریزی اقتدار ان مسلمانوں کی طرف سے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی قیادت کی تھی خار کھائے ہوئے تھا، وہ مسلمانوں کو اپنا اصل و دائمی حریف اور اسلام کو اپنے کیمپ کا متوازی و مقابل کیمپ سمجھتا تھا، دونوں کو اس کا دعویٰ تھا کہ وہ زندگی کی رہنمائی اور معاشرۂ انسانی کی تعمیر و تشکیل کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس معرکہ کی شعلہ سامانیوں اور "تاوان جنگ" میں مسلمانوں کا حصہ ملک کے ہر فرقہ سے زیادہ تھا۔ ان کو صورت حال کی سنگینی، اور دور رس خطرات کا پورا اندازہ تھا۔

لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس زبردست سازش اور مغربی تہذیب کے طوفانی یلغار کے سامنے بہت سی ان مسلم قوموں سے کہیں زیادہ ثابت قدم، سخت جان، ناقابل تسخیر اور اپنی اسلامی شخصیت اور معنوی دولت کی حفاظت میں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے جن کا انیسویں صدی کے اواخر یا بیسویں صدی کے اوائل میں مغربی اقتدار یا مغربی افکار سے واسطہ پڑا۔

مغربی تہذیب و تعلیم کی اس یلغار کے علاوہ ہندوستانی مسلمانوں کو ایک دوسری یلغار کا بھی مقابلہ کرنا پڑا، یہ عیسائی مشنریوں کی یلغار تھی جو انگریزی اقتدار کے اس ملک میں قدم جماتے ہی زور شور سے شروع ہوئی، اور قریب تھا کہ پورے ملک کو وہ اپنی لپیٹ میں لے لے، یہ عیسائی مشنری، جدید ترین اور موثر ترین اسلحہ سے لیس تھے۔ ان کو حکومت کی حمایت و سرپرستی بھی حاصل تھی، جو اس زرخیز ملک کو حضرت مسیحؑ کا عطیہ اور انعام سمجھ رہی تھی، اور اس اقتدار کو عیسائیت کے فروغ و اشاعت کے لئے ایک زریں موقع تصور کرتی تھی جس کو کسی حالت میں بھی ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہیئے تھا۔

ان مشنری سرگرمیوں اور پورے ملک کو عیسائی بنا لینے کے عزم و منصوبہ کے ساتھ تشکیک کی ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طاقت ور تحریک بھی جاری تھی جس کا مقصد اسلام سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو مسلمان نوجوانوں کی نظر میں مشتبہ و مشکوک بنا دینا تھا، خواہ اس کا تعلق شریعت و قانون سے ہو، یا مذہب و تمدن اور ثقافت و تاریخ سے، ہندوستان کے علماء نے ان دونوں تحریکوں اور طاقتوں کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کیا، انہوں نے معذرت و دفاع کی سیاست کو ترک کر کے، اقدام و حملہ کی سیاست اور بھرپور علمی تنقید کا راستہ اختیار کیا، اس کے نتیجہ میں تبلیغ عیسائیت کی یہ تیز و تند لہریں اور تشکیک کی پوری مہم پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی اور مسلمانوں کے اندر اسلام پر نیا اعتماد، اپنی تہذیب و ثقافت پر فخر، اور اپنی شخصیت و تاریخ کا احترام پیدا ہوا۔

اس زمانہ میں ذہین مسلم نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے مغربی تہذیب اور مغربی اقتدار کے مرکز "ولایت" کا رخ کیا، انہوں نے وہاں کی اعلیٰ یونیورسٹیوں اور شہرۂ آفاق کالجوں میں تعلیم حاصل کی، جدید علوم میں کمال پیدا کیا، انگریزی ادبیات میں بصیرت، اور انگریزی تحریر و تقریر میں اہل زبان کی طرح قدرت حاصل کی، جن کی قابلیت، زبان دانی، اور نکتہ شناسی کا انگریز ادباء اور اہل نظر نے بھی اعتراف کیا، لیکن مغربی علم و ادب کے سمندر میں غوطہ لگانے والوں میں خاصی تعداد میں مغربی فلسفے کے باغی اور حریف پیدا ہوئے جن کی مثال کسی دوسرے اسلامی ملک کے نوجوانوں میں نہیں ملتی، وہ مغربی طرزِ فکر کے زبردست ناقد و نکتہ چیں بن کر واپس آئے، یہی حال ان لوگوں کا بھی تھا جنہوں نے ہندوستان میں رہ کر مغربی علم و فلسفہ سے اس حد تک واقفیت پیدا کی جتنی خود مغرب میں ممکن تھی، انہوں نے پورے اعتماد و اطمینان کے ساتھ مغربی افکار پر تنقید و عمل جراحی کا فرض انجام دیا۔ اور اس کے افسوں کو باطل اور اس کے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا، کسی نے سنجیدہ عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں اس کا محاسبہ کیا اور کسی نے طنز و مزاح کے لطیف پیرائے میں اس کا مذاق اڑایا، مغربی تہذیب اور فلسفہ کے رعب کے کم کرنے اور اس کی ہوا خیزی میں دونوں کا حصہ ہے، ان اہل فکر و اہل قلم نے اسلام کو ایک مکمل دین اور ابدی پیغام کی حیثیت سے پیش کرنے، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے احساس کمتری کو دور کرنے اور اسلام اور اسلامی تہذیب کی صلاحیت و ابدیت پر اس کا اعتماد بحال کرنے میں بیش قیمت خدمت انجام دی، انہوں نے مغربی تہذیب کی دعوت کے مقابلہ میں ایک مضبوط اسلامی مورچہ قائم کیا، جس کا اصل و شعار مغرب کی امامت و سیادت اور ہر کمزوری اور نقص سے اس کے بالاتر ہونے کا انکار، اسلام کے ایک عالمگیر و زندہ جاوید پیغام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی، رہبر انسانیت اور پیشوائے کل ہونے کا اقرار و اعلان تھا۔ وہ اس یافت و دریافت میں ایسے سرشار اور اس ایمان و یقین میں ایسے مست ہوئے کہ ان کے ہر بنِ مو سے یہ صدا آنے لگی ؎

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے　　غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے بعد ہندوستان کی ملتِ اسلامی کو ایک نیا تجربہ پیش آیا اور وہ ایک اہم دور میں داخل ہوئی: ایک آزاد ملک کی آزاد زندگی کا تجربہ تھا جس کے آزادی کے اولین علمبردار، اور اس کے لئے بیش از بیش قربانیاں پیش کرنے والے یہی مسلمان تھے، یہ دور غیر ملکی اقتدار سے ملکی و قومی اقتدار کیطرف منتقلی کا دور ہے، جس میں نیا دستور مرتب ہوا، اور نئے قوانین وضع کئے گئے، معاشرہ کو ایک نئے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش شروع کی گئی نیا نظام تعلیم نافذ کیا گیا، اس موقع پر کئی بار خالص فرقہ وارانہ رجحانات نے سر اٹھایا۔ اور اسکی آبادی کی ایک کثیر تعداد پر جذباتی اور اعصابی دورے بھی پڑے، مسلمانوں کی حیثیت ان حالات میں ایک ایسی عددی اقلیت اور پسماندہ طبقہ کی تھی جس کو انگریزی اقتدار نے ہمیشہ کمزور و مغلوب اور کارزارِ حیات سے دُور رکھنے کی کوشش کی تھی، ماضی کا ترکہ اس کے گلے کا ہار بن چکا تھا۔ بہت سے شکوک و شبہات اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے، ملک سے باہر پیش آنے والے واقعات بھی اس کی زندگی اور قسمت پر اثر انداز اور ملک کے دوسرے فرقوں کے جذبات میں تلاطم برپا کرتے رہتے تھے اور یہ اقلیت بہت سے ناکردنی بلکہ بیرونی غلطیوں کی جوابدہ سمجھی جاتی تھی، یہ وہ حالات و واقعات ہیں جنہوں نے اس کو بہت نازک پوزیشن میں کھڑا کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس ملک کے مسلمان پوری خودداری و خودشناسی، اپنے دینی شعائر اور دینی و ملّی تہذیب و شخصیت کے ساتھ اپنے اس ملک میں رہنے کا عزمِ مصمّم کر چکے ہیں۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کی ذہانت کا بھی امتحان ہے۔ اور وفا کا بھی، ان کے مضبوط اور غیر متزلزل عقیدہ کی بھی آزمائش ہے۔ اور سچّی حب الوطنی کی بھی، ان کی طاقتور اور دلآویز شخصیت اور اعلیٰ کردار کی بھی، اور مثبت و تعمیری طرزِ فکر اور جذبۂ عمل کی بھی۔

یہ ایک ایسی کڑی اور دوہری آزمائش ہے جس کی نظیر قدیم اسلامی تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ اس لئے ہمیں اس سے کوئی بڑی مدد اور روشنی حاصل نہیں ہو سکتی۔ فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں بھی شاذ و نادر اس عجیب و غریب صورتِ حال کا ذکر ملے گا۔ کیا اس کی کوئی مثال ہے۔ کہ چھ کروڑ یا اس سے زائد کی اسلامی اقلیت کسی غیر مسلم اکثریت کے درمیان ہو، اور ایسے ملک میں جہاں پارلیمانی نظام قائم ہے، دستور کی حکمرانی ہے۔ جس نے سکولرازم و نامذہبیّت کو اپنا شعار بنایا ہے۔؟ اس لئے اب اس کے سامنے آبرومندانہ، باعزّت ایجابی و مثبت، زندگی گذارنے کا (جو اسلامی تعلیمات کے مطابق اور حقائق و واقعات کے ساتھ ہم آہنگ ہو) ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ ہے اسلام کی حکیمانہ، لازوال اور عالمگیر اصولوں سے روشنی و رہنمائی حاصل کرنا اعلیٰ درجہ کی فراست و بصیرت، طاقتور و ممتاز ملّی شخصیت، عزمِ صادق و ایمانِ راسخ، عزّت کی مختصر و جفاکش زندگی کی طویل اور خوشحال زندگی پر ترجیح اور ملک کی اخلاقی قیادت کا وہ منصبِ عالی حاصل کرنے کی خواہش و کوشش جو عرصہ دراز سے خالی ہے۔ اور کسی مردِ خدا اور دانائے راز کا منتظر ہے۔ اس ملک کے اسٹیج پر ایک ایسے مخلص، خدا ترس، اور اخلاق و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانی قائد کی حیثیت سے سامنے آتا جو ہر قسم کی نفس پرستی سے بلند، ذاتی و جماعتی اغراض سے بالاتر، محبِ وطن اور انسانی دوست و خدا پرست ہو اور وہ ملک کو انسانیت کی پستی، اخلاقی انتشار، خدا فراموشی، اور دولت و موقع پرستی کے اس عمیق غار میں گرنے سے (امکانی حد تک) بچانے کا عزم کر چکا ہو جس کے کنارے یہ ملک کھڑا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو اس ملت کو عام سطح سے اٹھا کر قیادت و رہنمائی کے منصب بلند تک پہنچا سکتا ہے اور حریف کی بجائے حبیب، مبغوض و محسود کی بجائے مخدوم و محبوب بنا سکتا ہے۔

دوسرا پہلو جس میں یہ ملت ہمیشہ سُرخ رُو، و باعظمت رہی ہے، اور جس کے ذکر سے میرا مقصد محض مدح سرائی اور قصیدہ خوانی نہیں، ایک تاریخی حقیقت کا اظہار ہے، وہ اس کا طاقتور دینی جذبہ، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے اسکی والہانہ شیفتگی اور مرکزِ اسلام سے اس کی وہ عقیدت اور قلبی تعلق ہے۔ جس نے مختلف تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی فتنوں سے اسکی بارہا حفاظت کی، اور اس کو ہندوستان میں آنے والی دوسری قوموں اور نسلوں کیطرح، یہاں کے فلسفوں میں یکسر تحلیل ہونے سے روکا، ہندوستانی مسلمانوں نے اسلام اور مسلمانوں کے تمام مسائل سے (خاص طور پر بیسویں صدی کی ابتداء سے) ہمیشہ سے گہری دلچسپی لی، خلافتِ عثمانیہ کی حفاظت و بقا کے لئے اس ملک میں جتنے جوش کا مظاہرہ کیا گیا (جس میں ہندو مسلمان دوش بدوش تھے) وہ اس کا ایک ثبوت ہے، تحریک خلافت جس کا برّصغیر میں سیاسی و قومی شعور پیدا کرنے میں بڑا ہاتھ ہے ایک ملک گیر عمومی تحریک تھی، اس کی وسعت و مقبولیت کا اندازہ صرف انہیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جنہوں نے وہ دور دیکھا ہے، اسی طرح فلسطین و مسجدِ اقصیٰ کی بازیابی کیلئے بھی مسلمانانِ ہند نے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہیں کی، اسلامی مسائل کے بارے میں خواہ ان کا تعلق دنیا کے دور دراز گوشوں سے ہو یہاں کی ملتِ اسلامی ہمیشہ سے بہت ذکی الحس واقع ہوئی ہے اور اس کا عمل اس بارے میں "داد و ستد" اور لین دین کے اصول پر نہیں ہے، یہ اس کے دینی جذبات اور مخصوص تربیت کا نتیجہ ہے۔

اس کا یہ جذبۂ اسلامی اور دین سے گہری وابستگی، ان دینی مدارس و مکاتب کی شکل میں بھی نمایاں ہے۔ جن کا سارے ملک میں ایک جال بچھا ہُوا ہے۔ اور جس سے کوئی شہر و قریہ مشکل سے بچا ہوگا، مسلمانوں نے علم و دین کے یہ قلعے، انگریزی حکومت کے استحکام اور تعلیمی نظام کے نئے رُخ کو سامنے رکھ کر قائم کئے تھے جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو کر ہزاروں تک پہنچتی ہے، ان میں ایک بڑی تعداد ان مدارس کی ہے جن کو علوم اسلامیہ کی طرف خصوصی توجہ کی بناء پر ہم عام طور پر "عربی مدارس" کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان مدارس میں عام طور پر صحاح ستہ کی اوّل سے آخر تک مکمل تعلیم کا انتظام ہے، اور خصوصیت کے ساتھ صحیح بخاری و صحیح مسلم،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جامع ترمذی، اور سنن ابی داؤد کیطرف زیادہ توجہ رہتی ہے۔ اور ان کو حرفاً حرفاً پڑھایا جاتا ہے۔ اس بارے میں شاید ہندوستان کے مدارس عربیّہ عالمِ اسلام میں منفرد ہیں۔ یہ مدارس قریب قریب سب غیر سرکاری ہیں۔ ملّتِ اسلامی ان کی کفیل ہے۔ اس ملک میں مخلص علماء ایثار پیشہ مدرسین اور رضاکار، داعی و مبلغ شروع سے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں، جو بڑی قناعت، سادگی اور ایک حد تک قربانی کے ساتھ دین و علم دین کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ زیادہ تر انہیں مدرسوں کا فیض ہے۔ اور ہندوستان میں سارے سیاسی انقلابات کے باوجود اب بھی دین سے جو گہرا لگاؤ پایا جاتا ہے۔ اور علم کی شمع روشن ہے وہ اسی طبقہ کار کا برکت اور ثمرہ ہے۔

جب ہندوستان کے عربی مدارس کا ذکر آ گیا ہے۔ تو ہندوستانی علماء و فضلاء مدارس کی اس خصوصیت کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ وہ نہ صرف ہندوستان کی تحریک آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کی صفِ اوّل میں تھے بلکہ اکثر اوقات انہوں نے اس تحریک و جدوجہد کی قیادت کی اور زیادہ غور سے دیکھا جائے، اور انصاف سے کام لیا جائے تو اوّل اوّل یہ خیال انہیں نے دیا، اور اس جذبہ میں جو حرارت، طاقت اور عمومیت پیدا ہوئی وہ انہیں کی رہینِ منّت تھی، ان میں سے متعدد اصحاب نے انگریزی حکومت کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے والوں کی عملی قیادت کی، انگریز فوجوں سے دو بار جنگ کی اور متعدد حضرات جزائر انڈمان و نکوبار اور جزیرہ مالٹا میں قید و نظر بند کئے گئے۔ اور کئی کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی، متعدد حضرات ایسے تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا خاصا حصہ ہندوستان کی جیلوں میں گذارا، حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ علماء اور دینی شخصیتوں کی تاریخ کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں رہا۔

ان کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے برّصغیر ہند کی زبان و ادب کی خدمت و ترقی میں قائدانہ حصہ لیا اور ۱۸۵۷ء کے بعد اس تحریک کی سربراہی اور رہنمائی کی، اردو کا قصرِ ادب جن مضبوط اور بلند ستونوں پر قائم ہے، ان میں سے بیشتر طبقۂ علماء سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے اُردو کو نیا رنگ و آہنگ، نئے اسلوب اور وہ سنجیدگی اور پختگی عطا کی جو اس وقت تک اردو کا سرمایۂ فخر ہے، ان میں سے ایک ایک مستقل دبستانِ ادب کا بانی ہے، جس کی اس وقت تک پیروی کی جا رہی ہے۔ اُردو شعراء کے مستند تذکرے اور اُردو زبان کے ظہور و ارتقاء کی تاریخ میں انہیں کی تصنیفات اس وقت تک اس موضوع میں ابتدائی ماخذ اور سند کا درجہ رکھتی ہیں اور ابھی تک ان سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں علوم مذہبی اور ملک کی زبان و ادب کے درمیان وہ خلیج کبھی نہیں رہی اور دونوں کے نمائندوں کے درمیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ بے گانگی اور اجنبیت بھی کبھی پیدا نہیں ہوئی جو بعض دوسرے اسلامی ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ اور جس کا نقصان دونوں طبقوں کو کم و بیش برداشت کرنا پڑا۔

اگر اجازت دی جائے تو میں بڑے ادب کے ساتھ ایک بات اور عرض کروں گا، وہ یہ کہ ہندوستانی مسلمان خدا کے فضل سے بڑی حد تک اسلام کے معاملہ میں خود کفیل ہیں، وہ اسلام کے اوّلین و حقیقی سرچشموں کتاب و سنّت، اور اسلام کے اوّلین علمبرداروں کی سیرت و کردار، ان کی قربانی، و ایثار، اور ان کی اولوالعزمی و بلند ہمتی کی جلائی ہوئی شمع سے روشنی حاصل کرتے ہیں، انہوں نے اپنا عقیدہ و ایمان، اپنا حال و مآل اسلام کے چمکتے ہوئے سورج کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ مسلم اقوام یا عرب ممالک کے ابھرتے ڈوبتے ستاروں یا ٹمٹماتے چراغوں سے نہیں، وہ آنکھ بند کر کے ان میں سے کسی کی انگلی پکڑ کر چلنے والے نہیں ہیں، نہ انہوں نے ان میں سے کسی کی اسلام کے ساتھ وفاشعاری کو اپنی وفاشعاری کی شرط قرار دی ہے۔ انہوں نے اللہ کے بھروسہ پر یہ فیصلہ کیا ہے۔ کہ ان کو اسلام اور اسلامی تعلیمات کو اپنے سینہ سے لگائے رکھنا ہے۔ خواہ دنیا کی کوئی قوم (عرب ہو یا عجم) اس سے بے تعلقی یا روگردانی اختیار کرے، اگر عرب یا دوسرے ممالک کے مسلمان اپنی پرانی تہذیبوں اور قدیم فلسفوں کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ تو ہم انشاءاللہ وحدتِ اسلامی اور شریعتِ اسلامی کا دم بھرتے رہیں گے۔ ہم اسلامی اصولوں اور اسلام کے مسلکِ زندگی کے معاملہ میں کسی قسم کا سودا کرنے کے لئے تیار نہیں ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس ملک میں اور اس ملک کے باہر اپنی اس اصول پسندی اور وفاشعاری کی قیمت ادا کرنی پڑے گی، ہمیں بہت سے ان منافع و مواقع سے آنکھیں بند کرنی پڑیں گی جو ہوا کے رخ پر چلنے والی ملتوں اور فرقوں کو حاصل ہوتے ہیں، لیکن ہمارا یقین ہے کہ ہمارا خدا اگر ہم سے راضی ہے اور ہم خلوص و فہم کے ساتھ اپنے اصولوں پر قائم ہیں تو ہمارے لئے کوئی تنگی اور ہماری قسمت میں محرومی نہیں لکھی ہے۔ اس لئے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ ساری کائنات ارادۂ الٰہی کے تابع ہے اور اس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے ہمارا مسلک اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ؎

گلہ نہیں جو گریزاں ہیں چند پیمانے   نگاہِ یار سلامت! ہزار میخانے

حضرات! ان سب وجوہ کی بنا پر شاید اس سرزمین کو بہت سے دوسرے اسلامی ملکوں سے اس کا زیادہ حق ہے کہ اس کو ایسے مایۂ ناز اور منتخب روزگار علماء، اربابِ فکر و نظر، ماہرینِ تعلیم اور اساتذہ و معلمین کی میزبانی کا شرف حاصل ہو، اور وہ خود یہاں تشریف لا کر اپنی آنکھوں سے ان کوششوں کے نتائج کو دیکھ سکیں، جو ایک بے سروسامان اور بے نوا ملّت نے اپنے دین کی خدمت اور علومِ اسلامیہ کی ترقی و اشاعت کے سلسلہ میں کی ہیں۔ اور یہ دیکھیں کہ ابھی اس کو کتنی طویل مسافت طے کرنی ہے، اور وہ اس سفر میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کی کیا رہنمائی کر سکتے ہیں۔؟

دوسری حیثیت سے میں آپ کا خیر مقدم لکھنؤ کے اس تاریخی شہر میں کر رہا ہوں جو اپنی مردم خیزی، علم پروری، علماء نوازی میں دہلی کا ہمسر اور اس کا ہم ردیف رہا ہے۔ یہ دہلی کے بعد ہندوستانی تہذیب و تمدن ادب و شائستگی اور اردو زبان و شاعری کا گہوارہ تھا، اور یہی ہندوستان کی قدیم تعلیمی تحریک کا مرکز تھا، یہاں وہ سرآمد روزگار علماء پیدا ہوئے جن کے علم کے چشمے ایک طرف مشرق کے آخری حدود تک، دوسری طرف جنوب کے کناروں تک بہے اور ایک عالم نے ان سے اپنی علمی پیاس بجھائی، قدیم نصاب درس (درس نظامی) یہیں ترتیب و تکمیل کے آخری مراحل کو پہنچا، جس کا سکہ ایک زمانہ میں برصغیر ہند سے لیکر افغانستان و ترکستان تک چلتا رہا ہے، اس شہر کو آخری دور میں قرآن مجید کی خدمت اس کے حفظ و تجوید اور اشاعت و تبلیغ کا وہ شرف بھی حاصل ہوا جس میں کم نامی گرامی اسلامی شہر اس سے سبقت لے جانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

حضرات! تیسری حیثیت سے اس اہم تعلیمی مرکز میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں جہاں اسلامی فکر و شعور بحث و نظر اور علمی بصیرت اور دور بینی کی تاریخ کا ایک دلآویز و درخشاں باب تحریر کیا گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں اس تلخ و ترش حقیقت کا احساس پہلی بار مجسم اور ٹھوس شکل میں سامنے آیا کہ چودھویں صدی ہجری کے آغاز اور انیسویں صدی کے اواخر میں عالم اسلام تفرقہ و انتشار، پریشان خیالی، اور فکری اضمحلال کی کس آخری منزل میں تھا، نئے تغیرات اور نئے حوادث کا سامنا کرنے اور نئے مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت علمائے دین میں (جو ملت کے حقیقی قائد تھے) اور اس طریقۂ تعلیم سے جو ان کو پیدا کرنے کا واحد ذریعہ تھا کس تیزی سے مفقود ہوتی جا رہی تھی، مسلم معاشرہ دو متوازی طبقوں کے درمیان منقسم ہو گیا تھا، ایک طرف علمائے دین تھے، جو عربی مدارس سے قدیم طرز پر پڑھ کر نکلے تھے، دوسری طرف مغربی تعلیم یافتہ حضرات جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروردہ تھے۔ ان دونوں کے درمیان اجنبیت اور بیگانگی کی خلیج تھی اور یہ خلیج دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، اندیشہ تھا کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے کہ کسی ملانے والے کے بغیر ان کی ملاقات اور کسی ترجمان کے بغیر افہام و تفہیم ممکن نہ ہو۔

معاملہ انہیں دو طبقوں میں منحصر نہ تھا، ملت کے مختلف مذہبی فرقے اور فقہی مسلک ایک دوسرے کو تحقیر یا خوف و نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے، مناظروں اور مجادلوں کا بازار گرم تھا، اور وہ کبھی کبھی سخت جارحانہ شکل اختیار کر لیتے تھے معاملہ صرف اثبات و تردید تک محدود نہ تھا، بلکہ تفسیق و تکفیر تک کی گرم بازاری تھی، جہاں تک نصاب درس کا تعلق ہے اس میں کسی کمی یا زیادتی کی گنجائش نہیں سمجھی جاتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی علمی حلقوں پر بالعموم ذہنی عزلت اور گوشہ نشینی کی فضا طاری تھی اور جدید دنیا کے علوم و افکار اور علمی تحقیقات کے لئے کوئی روزن کھلا نہیں رہ گیا تھا، تیز رو اور تغیّر پذیر زندگی سے صرف، اسی وقت واسطہ پڑتا تھا، جب علماء سیاست کے راستہ پر گامزن ہوتے ہُسلم معاشرہ کی پاسبانی و نگرانی مغربی علوم کے حملوں اور اس کے تشکیکی اثرات سے مسلمان نوجوانوں کی حفاظت سے علماء کنارہ کش ہوتے جا رہے تھے۔ اور تعلیم یافتہ طبقہ مغرب کے غاشیہ برداروں اور فکری و تہذیبی شکست کے نقیبوں کے رحم و کرم پر تھا۔

اس نازک بحرانی دور میں (۱۳۱۱ھ - ۱۸۹۴ء) کچھ منتخب اہلِ نظر و اہلِ درد جن کو فراستِ ایمانی اور دردِ اسلامی کا حصّہ وافر ملا تھا سرجوڑ کر ایک جگہ بیٹھے اور انہوں نے اس کا ایک حل تجویز کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب اہلِ نظر اہلِ دل کے ساتھ علماء دین جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ مذہب حنفی کے علمبردار علمائے اہلِ حدیث کے ساتھ زاہد و گوشہ نشین، امراء و رؤساء اور ماہرینِ تعلیم کے ساتھ شانہ بشانہ اور صف بصف نظر آئے، ان لوگوں نے اس مقصد کے لئے ایک انجمن قائم کی اور اس کا نام "ندوۃ العلماء" تجویز کیا اس لئے کہ یہ انجمن دراصل جماعتِ علماء ہی کے غور و فکر اور انہیں کی دعوت پر قائم ہوئی تھی اور وہی اس کے روحِ رواں تھے، اس انجمن نے جن بنیادوں پر اپنے سفر کا آغاز کیا وہ تھیں مسلمانوں کا باہمی اتحادِ اسلامی نشاتِ ثانیہ کے لئے مختلف اجتماعی، اصلاحی و تعلیمی کوششوں میں ہم آہنگی، اعلیٰ سیرت و کردار کی تشکیل رسوم قبیحہ کا استیصال، مسلمانوں کے مختلف امور و مسائل کے حل کے لئے مختلف مسلک و مشرب کے صحیح العقیدہ (اہل سنت والجماعت) علماء کے ایک مشترک پلیٹ فارم کی تشکیل، اسلامی اصولوں اور شریعتِ اسلامی کے مقاصد کو سامنے رکھ کر علوم دینیہ کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں جو عصرِ حاضر کے تقاضوں کی تکمیل کر سکیں علماء کی دینی سطح کو بلند اور ان کے فکر و معلومات کے افق کو وسیع کرنا اور ایسے علماء تیار کرنا جو قدیم و جدید دونوں طبقوں کے اعتماد کے اہل اور احترام کے مستحق اور مسلمانوں کے دینی، فکری، علمی قیادت کے اس منصب پر فائز ہو سکیں جو عرصہ سے خالی چلا آ رہا ہے۔

انہوں نے قرآن مجید کے متن و تفسیر کے طریقۂ تعلیم کیطرف خصوصی توجہ دی، علومِ آلیہ اور علوم عالیہ اور وسائل و مقاصد میں تفریق کی، متقدمین میں جو اصحاب دین و علم کا مذاق صحیح اور ملکۂ راسخہ رکھتے تھے ان کی تصنیفات کو اصولاً متاخرین کی تصنیفات پر مقدم رکھا گیا محض "کتاب خوانی" کی بجائے "علم آموزی" کیطرف توجہ کی گئی، نصاب میں عربی زبان کو اس کے شایانِ شان اور معزز جگہ دی گئی، اس لئے کہ وہ عرصۂ دراز سے غفلت کا شکار تھی، اور عہدِ آخر میں وہ اپنے زوال کے آخری نقطہ پر پہنچ چکی تھی اور نصاب درس اور علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں اسکی حیثیت ایک حاشیئے سے زیادہ نہ تھی یہاں ایک ایسی زندہ اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے اسکی تعلیم کا انتظام کیا گیا جو زندگی اور قوت سے بھرپور ہے۔ زمانہ کی تمام ضرورتیں پوری کر سکتی ہے۔ اور اس سے دعوت اور اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افکار و خیالات کی اشاعت کا بڑا کام لیا جا سکتا ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ یہاں کے طلبہ اور منتسبین اس کے ذریعہ قرآن مجید کے جمال حسی و معنوی اور اس کے اعجاز و بلاغت سے ذوق حاصل کر سکیں، حدیث نبوی کی فصاحت و شیرینی سے لطف اندوز ہوں اور وہ اہل عرب کو ان ہی کی زبان اور ان ہی کے اسلوب میں خطاب کر سکیں اور اس کے ذریعہ عصر حاضر کے فتنوں اور گمراہ کن تحریکوں اور دعوتوں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکیں یہ اس زمانہ میں جب مواصلات اور رسل و رسائل کا یہ سلسلہ موجود نہ تھا، اور بیرونی سفروں کا سلسلہ اس طرح شروع نہ ہوا تھا، ایک انوکھی اور اپنے زمانہ سے آگے کی بات تھی اب جبکہ ممالک عربیہ و اسلامیہ آزاد ہو چکے ہیں، اور بین الاقوامی سطح پر اجتماعات وفود کی آمد و رفت اور مذاکرہ و تبادلۂ خیال ایک عام بات بن چکی ہے۔ ہمارے لئے اس فیصلہ کی اہمیت اور ندوۃ العلماء کے بانیوں کی عربی زبان سے خصوصی اور غیر معمولی دلچسپی کا راز سمجھنا کچھ مشکل نہیں -؟

انہوں نے اس کے ساتھ بعض مفید اور جدید علوم کو بھی جن سے ایک عالم دین کو ناواقف نہ رہنا چاہیئے، اپنے نصاب میں شامل کیا اور مروجہ سرکاری زبان کی تعلیم کا بھی انتظام کیا، ان مقاصد اور آرزوؤں کی تکمیل کے لئے سنہ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں ان حضرات نے تجربہ و نمونہ کے طور پر لکھنؤ میں ایک دارالعلوم قائم کیا اور اس کا نام دارالعلوم ندوۃ العلماء تجویز کیا جو اپنی شہرت و مقبولیت اور زبان زد ہونے کی وجہ سے ندوہ ہی کے نام سے موسوم و معروف ہے۔ ورنہ یہ دراصل اس انجمن کا نام ہے جو اس مدرسہ کی نگراں و سرپرست ہے، اس انجمن کی تاریخ اور اس کی مرحلہ وار داستان اور اس دارالعلوم کی کہانی جس کے وسیع و خوشنما سبزہ زار میں ہم اور آپ آج جمع ہیں اور اسکی عہد بہ عہد ترقیاں آپ ان رسائل اور کتابچوں میں پڑھیں گے (جو آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے ہیں) اور آئندہ مقالہ میں سنیں گے۔ اس مرکز علم و دین یا اس انجمن کے قائم کردہ دارالعلوم کی کشادہ فضاؤں میں جو ایک مرکز تعلیم سے زیادہ ایک وسیع اور جامع مدرسۂ فکر اور فکری و اصلاحی تحریک ہے۔ ہم سب آپ کا انتہائی گرمجوشی سے استقبال کرتے ہیں۔ اور اس تاریخ ساز اجتماع اور مبارک و منتخب محفل میں جس کے واقعات اور داستانیں شاید آنے والے زمانہ میں شکر و اعتراف کے لہجہ میں سنائی جائیں اور ایک مقدس امانت اور قیمتی اثاثہ کیطرح ہماری نئی نسل کیطرف منتقل کی جائیں اور جس اجتماع میں اللہ کے فضل سے عالم اسلام نے اتنی فیاضی سے اپنے جگر کے ٹکڑے اور آنکھ کے تارے ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں کہ اسکی مثال ہمیں اس ملک کے ماضی قریب کی تاریخ میں نہیں ملتی ہم دوبارہ اپنے معزز مہمانوں کی خدمت میں اسلام اور علم کا مشترکہ سلام پیش کرتے ہیں —— یہ ملت اور یہ سرزمین پہلے بھی احسان فراموش نہ تھی اس نے پہلے بھی اپنے عزیز و معزز مہمانوں کی آمد پر شکر و فخر کیا ہے اور آج جبکہ اتنی کثیر التعداد اور یگانہ شخصیتوں نے اس کو اپنے قدوم سے رونق و عزت بخشی ہے اس کا سر فخر سے اونچا اور اس کی زبان شکر و مسرت کے ملے جلے جذبات کیساتھ اس طرح زمزمہ سنج ہوتی ہے ؎

من آں خاکم کہ ابر نو بہاری — ز لطفش کرد بر من قطرہ باری

گر بر [illegible] زبانم — [illegible] شکر [illegible] کے توانم

© rasailojaraid.com